مئی 2025ء

ISSN 2456-0375

نئی نسل کا معمار اور تعمیر و ترقی کا داعی

ماہنامہ

رفیقِ منزل

وقف ترمیمی قانون

مضمرات اور مطلوب جدوجہد

نئی نسل کا معمار اور تعمیر و ترقی کا داعی

ماہنامہ

رفیقِ منزل

مئی
۲۰۲۵ء

ذوالقعدة-ذوالحجة ۱۴۴۶ھ

جلد : ۴۰ شمارہ : ۵

مدیر
مبشر الدین فاروقی

معاون مدیر
صفی الرحمٰن نبیل

مجلسِ ادارت
عبدالخالق سبحانی، اشہد شیرازی، مدثر شیخ، معتصم سعد خان، معز الحق، غالب فلاحی، مزمل احمد خان، شیخ لقمان، فضل الباری عرفان، صادق پرویز، سعادت اللہ کوتوال، صلاح الدین جاگیردار، انشاء عبدالغفار شیخ، مدیحہ عنبر

Executive Manager
Samaullah Mallick

Layout & Cover Design
Syed Aasim Suhail

editor@rafeeqemanzil.com

₹30 | سالانہ ₹300

ذکر
جنت وجہنم: دو کردار-دو انجام
اشہد رفیق ندوی 02

شرر
وقف قانون، موجودہ حالات اور داخلی احتساب۔۔۔؟
03

نظر
وقف ترمیمی قانون سے متعلق ملک معتصم خان صاحب سے خصوصی گفتگو
ادارہ 04

نظر
مسلمان نئے وقف بل کی مخالفت کیوں کر رہے ہیں؟
ڈاکٹر ظفر الاسلام خان 07

نظر
وقف ترمیمی ایکٹ 2025ء: دستور اور قانون کی روشنی میں تنقیدی جائزہ
اکرام الحق 09

نظر
وقف تحریک: عدالت واحتجاج کا امتزاج
ڈاکٹر سلیم خان 13

فکر
مولانا منظور نعمانی: حیات وخدمات
محمد منور کمال ندوی 16

فکر
'کیا ایک فرقے کے علاوہ۔۔۔'
وارث مظہری 19

رزم
ایک ملک ایک سبسکرپشن۔۔۔
ضرار شیخ 21

رزم
IIISR - ایک تعارف
عبدالحئ اثری فلاحی 24

وطن
اتراکھنڈ-یکساں سول کوڈ یا ہندوتوا ایجنڈا؟
ابھے کمار 27

وطن
ہندوستان میں مسلمانوں کی سماجی ومعاشی پسماندگی۔۔۔
روشن محی الدین 32

نظم اجتماعی ظرف — عاصم سہیل 36

صریر پاتھ ویز ٹو ہوپ۔۔ — مجتبیٰ فاروق 40

بزم قیادت اور حکمت 42 | وقت کو استعمال کرنے کے اصول 45 | سمیہ رمضان کی کتاب "قرآن پر عمل" 47 | **محفل** 46 | **بزم ریحان** 43

D-307, Dawat Nagar, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025 | Mob. +91 7042406091 | Email: subscribe@rafeeqemanzil.com | www.rafeeqemanzil.com

Printed on behalf of The Students Islamic Organisation ofIndia, Printer & Publisher Tanveer Alam, Printed at Bharat Offset, 2034/35, Qasim Jan Street, Ballimaran, Delhi - 110006, Published from 230, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025 | **Editor: Mubasheruddin Farooqi**

مضمون نگار کے خیالات سے ادارہ یا تنظیم کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

اتراکھنڈ

یکساں سول کوڈ یا ہندوتوا ایجنڈا؟

اتراکھنڈ کا یکساں سول کوڈ

اتراکھنڈ ملک کی پہلی ریاست بن گئی ہے جس نے یکساں سول کوڈ نافذ کر دیا ہے۔ اس قانون کے دائرے میں ریاست کے تمام مذاہب کے باشندے آ گئے ہیں۔ نکاح، طلاق، اور میراث جیسے معاملات میں تمام مذاہب اور فرقوں کے لیے یکساں قوانین بنائے گئے ہیں۔ جو افراد اتراکھنڈ کے ڈومیسائل ہولڈر رہیں لیکن ریاست سے باہر رہتے ہیں، ان پر بھی یہ قانون نافذ ہوگا۔ اس قانون کے نفاذ کے بعد ریاست کے تمام مذاہب کے شہریوں کے لیے شادی اور طلاق کی رجسٹریشن لازمی قرار دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ، لیو اِن ریلیشن شپ میں رہنے والے جوڑوں کے لیے بھی رجسٹریشن ضروری ہوگا۔ تاہم، درج فہرست قبائل کو اس قانون کے دائرے سے باہر رکھا گیا ہے۔ سیاسی مصلحت کی وجہ سے بی جے پی ابھی قبائلی لوگوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتی۔

اتراکھنڈ کے وزیرِ اعلیٰ پشکر سنگھ دھامی نے 27/ جنوری کو یکساں سول کوڈ سے متعلق دہرادون میں واقع ریاستی سیکریٹریٹ میں ایک ویب پورٹل کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر وزیرِ اعلیٰ دھامی نے کہا کہ یہ اقدام ہر شہری کے لیے انصاف اور مساوات کو یقینی بنانے کی جانب ایک اہم قدم ہے۔ یکساں سول کوڈ کی حمایت کرنے والی بھگوا جماعت کی لابی کی یہ دلیل ہے کہ یکساں سول کوڈ مذہب پر مبنی عائلی قوانین سے بہتر ہے، کیونکہ یہ مساوات کو فروغ دیتا ہے۔

دوسری طرف، اس قانون کے ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ اقلیتوں کی مذہبی اور ثقافتی آزادی پر ضرب لگاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں، اس قانون نے عوام کی پرائیویسی پر بھی حملہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر، اس قانون کے نفاذ کے بعد لیو اِن ریلیشن شپ کے لیے لازمی رجسٹریشن کی بھی تنقید ہو رہی ہے، اور کہا جا رہا ہے کہ یہ شہریوں کی نجی آزادی اور ان کی پرائیویسی میں مداخلت ہے۔ ماہرینِ قانون کا کہنا ہے کہ ایک لبرل معاشرے میں ریاست کا یہ کام ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اپنے شہریوں پر نظر رکھے کہ ان کے تعلقات کس کے ساتھ ہیں اور کس کے ساتھ نہیں۔ دو بالغ افراد کے درمیان رشتے کا فیصلہ ریاست کے بجائے خود ان کی مرضی پر ہونا چاہیے۔

بتایا جا رہا ہے کہ یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے بعد شادی اور طلاق جیسے معاملات کا لازمی طور پر رجسٹریشن ضروری ہوگا۔ اگر کسی نے ایسا نہیں کیا، تو انہیں سرکاری اسکیموں سے باہر کر دیا جائے گا۔ یہ بھی یاد رہے کہ سرکاری فلاحی اسکیمیں پہلے ہی نئی اقتصادی پالیسیوں کی زد میں آ کر کم ہو رہی ہیں۔ اس کے بعد مزید شرائط نافذ کرنے سے عوام سرکاری منصوبوں سے مزید محروم ہو جائیں گے۔

یکساں سول کوڈ کا اصل ہدف مسلمان کس حد تک ہیں، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس قانون کے نفاذ کے

ابھے کمار

مضمون نگار نے جدید تاریخ میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ہے، مسلم پرسنل لا پر ان کی کتاب زیرِ طبع ہے۔

debatingissues
@gmail.com

بعد حلالہ کے عمل کو انجام دینے والے کو تین سال قید، ایک لاکھ روپے جرمانہ، یا دونوں سزائیں دی جا سکتی ہیں۔ مسلمانوں کو حلالہ کے نام پر بدنام کیا جاتا ہے، اور دائیں بازو کا یہ پروپیگنڈا رہا ہے کہ مسلم مرد حلالہ کے بہانے خواتین کا جنسی استحصال کرتے ہیں۔ لیکن کیا واقعی ایسا ہو رہا ہے؟ اس بارے میں افواہیں پھیلانے والے افراد کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کرتے۔ مسلمان اس وجہ سے خوف زدہ ہیں کہ جیسے ہی حلالہ پر سخت سزا کا قانون بن گیا، اس کا بے جا استعمال معصوم افراد پر کیا جائے گا۔

اس قانون کے تحت شادی کی عمر بھی متعین کر دی گئی ہے، جو تمام مذاہب کے لوگوں پر لاگو ہوگا۔ شادی کے لیے لڑکے کی عمر 21 سال اور لڑکی کی عمر 18 سال سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ طلاق کے معاملات میں مردوں اور عورتوں کو مساوی حقوق دینے کا دعویٰ کیا گیا ہے، جبکہ اس قانون میں کثرتِ ازدواج پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

یکسانیت کے نام پر تضاد

مگر تضاد دیکھیے کہ ریاست میں یکساں سول کوڈ کی پُرزور وکالت کرنے والے وزیرِ اعلیٰ دھامی اس قانون کی تعریف میں ہندو مذہبی علامتوں کا کھلے عام استعمال کر رہے ہیں۔ ان کے بیانات ان خدشات کو تقویت دیتے ہیں کہ دائیں بازو کی تنظیمیں یکسانیت کے بہانے اکثریتی سماج کے عقائد اور رسومات کو اقلیتوں پر تھوپنے کی سازش کر رہی ہیں۔

وزیرِ اعلیٰ دھامی نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ اتراکھنڈ سے بہنے والی یکساں سول کوڈ کی 'گنگا' کا سہرا دیو بھومی اتراکھنڈ کے دیوتا کے سمان لوگوں کو جاتا ہے۔ ایسے بیانات سُن کر اقلیتیں بے چین ہیں۔ ان کا یہ خوف بے جا نہیں، کیونکہ بی جے پی کے وزیرِ اعلیٰ کے بیانات واضح اشارہ کر رہے ہیں کہ یکساں سول کوڈ کا اصل ہدف مسلم سماج ہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، دھامی اس قانون کے بہانے اکثریتی سماج کی مذہبی علامتوں کا سیاسی استعمال کر رہے ہیں۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ دائیں بازو کے عناصر اقلیتوں کی مذہبی علامتوں اور ان کی ثقافت کے بارے میں تعصب رکھتے ہیں اور اقلیتوں پر یہ دباؤ ڈالتے ہیں کہ وہ اپنی مذہبی اور ثقافتی نشانیوں کو ترک کر دیں یا انہیں صرف اپنے گھروں کی چہار دیواری تک محدود رکھیں اور انہیں عوامی مقامات پر لانے کی غلطی نہ کریں۔ حجاب کی ہی مثال لے لیجیے۔ دائیں بازو کو یہ بالکل پسند نہیں کہ مسلم لڑکیاں پبلک اسکولوں میں حجاب پہن کر آئیں، مگر سرکاری تعلیمی اداروں میں ہندو مذہب سے متعلق پوجا پاٹھ کا وہ بھرپور دفاع کرتے ہیں۔ کیا یہ بھگوا جماعت کی دوہری پالیسی نہیں ہے؟

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اکثریتی سماج کے مذہب اور ثقافت کے مظاہرے کو دائیں بازو کے عناصر عوام کے طرزِ زندگی کا نام دے کر ان کی پبلک نمائش کو فطری قرار دیتے ہیں، جبکہ اقلیتوں کی مذہبی علامتوں کو مذہبی شدت پسندی سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ آسان لفظوں میں کہیں تو اکثریتی سماج کے مذہب اور کلچر کو قومی کلچر قرار دینے میں دائیں بازو کو ذرا بھی وقت نہیں لگتا، جبکہ اقلیتوں کی مذہبی اور ثقافتی علامتوں کے منظرِ عام پر آنے کو وہ سیکولرزم پر ایک بڑے حملے سے تعبیر کرتے ہیں۔

کچھ اسی طرح کا موقف وزیرِ اعلیٰ دھامی کے بیانات اور پالیسیوں میں بھی نظر آ رہا ہے، جو یکساں سول کوڈ کی تعریف میں نہ صرف ہندو مذہبی علامتوں کا استعمال کر رہے ہیں، بلکہ یہ بھی کُھل کر کہہ رہے ہیں کہ اس کے نافذ ہونے سے مسلمانوں میں موجود حلالہ، عدت اور طلاق پر روک لگے گی۔ یکساں سول کوڈ کی حمایت میں کیے جا رہے پروپیگنڈے کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ بی جے پی حکومت کے نزدیک یکساں سول کوڈ کا بنیادی مقصد جنسی مساوات حاصل کرنا نہیں، بلکہ اسے مسلمانوں کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا ہے۔ بھگوا جماعت کے تربیت یافتہ لیڈران اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ جنسی مساوات کی جدوجہد انتہائی اہم ہے، لیکن اسے فرقہ وارانہ رنگ دینا اس پورے مقصد کو سبوتاژ کرنے کے مترادف ہے۔

مسلم پرسنل لا کے متعلق دروغ گوئی اور اصل ایجنڈا

وزیرِ اعظم نریندر مودی جیسے بی جے پی کے سرکردہ لیڈر تک نے یکساں سول کوڈ کا استعمال مسلمانوں کے خلاف ایک حربے کے طور پر کیا ہے۔ گزشتہ سال، جب یومِ آزادی کے موقع پر وزیرِ اعظم مودی نے لال قلعے سے اپنی تقریر ختم کی تو عوام کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اپنی تقریر میں وزیرِ اعظم نے مسلم پرسنل لا کو نشانہ بناتے ہوئے اسے کمیونل پرسنل لا قرار دیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ آزادی کے بعد سے بھارت میں کمیونل پرسنل لا نافذ رہا ہے، جو سماج میں بھید بھاؤ اور اونچ نیچ کو بڑھاوا دیتا ہے۔ یہ پرسنل لا مذہب پر مبنی ہے، جو سماج میں دوریاں پیدا کرتا ہے۔ انہوں نے سپریم کورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ عدالت بھی یکساں سول کوڈ کی بات کرتی رہی ہے۔ وزیرِ اعظم نے یہ بھی کہا کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ملک میں ایک سیکولر سول کوڈ بنایا جائے اور ایسا ہی کچھ خواب آئین ساز لیڈروں نے بھی دیکھا تھا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وزیرِ اعظم کا یہ بیان پوری طرح سیاست سے متاثر نظر آیا۔ ان کی تقریر کا لہجہ بھگوا جماعت کے پرچارکوں کی طرح محسوس ہوا۔ بھگوا عناصر اکثر یہ افواہ پھیلاتے ہیں کہ پرسنل لا کا فائدہ صرف مسلمانوں کو ملتا ہے، جبکہ

حقیقت یہ ہے کہ بھارت کے تمام مذہبی گروپوں کے اپنے اپنے پرسنل لا ہیں۔ مسلمانوں کی طرح، ہندو، عیسائی، اور پارسی سماج کے اپنے اپنے پرسنل لا ہوتے ہیں۔ آدی واسی سماج کے بھی اپنے روایتی قوانین ہوتے ہیں، جنہیں ماننے کے لیے وہ پوری طرح آزاد ہیں۔

جب وزیرِ اعظم نے کہا کہ پرسنل لا کمیونل ہوتا ہے، تو کیا وہ ہندو کوڈ بل کو بھی کمیونل سمجھتے ہیں؟ وزیرِ اعظم سے ایسے سوالات پوچھنے کی ہمت میڈیا بھی نہیں کرتا۔ تاہم، مودی کی تقریر کو سُن کر یہ ظاہر تھا کہ ان کا نشانہ مسلم پرسنل لا تھا۔ پرسنل لا کی بات کر کے وہ اپنے سخت گیر حامیوں کو یہ یقین دہانی کروا رہے تھے کہ ان کی حکومت مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ کچھ ایسا ہی کام اتراکھنڈ میں وزیرِ اعلیٰ دھامی بھی کر رہے ہیں، جن کے پاس ریاست میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور ماحولیاتی تباہی کا کوئی ٹھوس حل نہیں ہے۔ اصلی مسائل سے توجہ ہٹانے اور اپنے شدت پسند حامیوں کو خوش رکھنے کے لیے یکساں سول کوڈ کا کارڈ کھیلا جا رہا ہے۔

یکساں سول کوڈ کی حمایت کے پیچھے مسلم مخالف بیانات چلائے جا رہے ہیں۔ بھگوا جماعت یہ غلط فہمی پھیلا رہی ہے کہ مسلم مرد، پرسنل لا کی آڑ میں مسلم مرد خواتین کا استحصال کرتے ہیں۔ فرقہ پرست طاقتیں یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ مسلمان مرد چار چار شادیاں کر کے درجنوں بچے پیدا کر رہے ہیں اور ملک کی آبادی کا تناسب تبدیل کر رہے ہیں تا کہ ہندوؤں کو اقلیت میں تبدیل کر سکیں۔ مسلمانوں کو فسادی دشمن بنا کر یکساں سول کوڈ کے بہانے اکثریتی برادری کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے بی جے پی پوری کوشش کر رہی ہے۔ اتراکھنڈ میں اس آئین اور اقلیت مخالف پالیسی کی شروعات کی گئی ہے۔

اتراکھنڈ کی مجموعی آبادی ایک کروڑ سے زیادہ ہے، جس میں ہندوؤں کی اکثریت ہے، جو تقریباً 83 فیصد پر مشتمل ہے۔ ریاست میں مسلم کمیونٹی دوسری سب سے بڑی مذہبی اقلیت ہے، جن کی آبادی تقریباً 14 فیصد ہے، جبکہ عیسائیوں کی تعداد محض نصف فیصد سے بھی کم ہے۔ یاد رہے کہ 2022ء کے ریاستی انتخابات جیتنے کے بعد اتراکھنڈ کی بی جے پی حکومت نے یکساں سول کوڈ کو نافذ کرنے کی سمت میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ حکومت نے ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی تھی، جس کی صدارت سپریم کورٹ کی سبکدوش جج، جسٹس رنجنا پرکاش دیسائی نے کی۔ 2/ فروری کو کمیٹی نے اپنا مسودہ حکومت کو پیش کیا، جسے کابینہ نے 4/ فروری کو منظور کر لیا۔ اس قانون کا مسودہ 750 صفحات پر مشتمل ہے، جس میں 392 سیکشن ہیں، اور اسے چار جلدوں میں تیار کیا گیا ہے۔ 7/ فروری کو اسمبلی کے خصوصی اجلاس میں اس بل کو پاس کیا، جسے گورنر لیفٹیننٹ جنرل گورمیت سنگھ کے پاس بھیجا گیا، جنہوں نے 28/ فروری کو اس کی منظوری دے دی۔ اس کے بعد، یہ بل صدرِ جمہوریہ دروپدی مرمو کو بھیجا گیا۔ 13/ مارچ کو صدرِ جمہوریہ نے اس کی توثیق کر دی، جس کے بعد یہ قانون بن گیا۔

بھگوا جماعت پوری شدت کے ساتھ یکساں سول کوڈ کو قومی مساوات اور ملک کی ترقی سے جوڑ کر پیش کر رہی ہے۔ مگر آزادی کی لڑائی کے دوران قومی لیڈروں نے اقلیتوں کے عائلی قوانین کے تحفظ کی بات کہی تھی۔ آزادی کی تحریک کے دوران بھی اکثریتی برادری سے تعلق رکھنے والے کئی مجاہدینِ آزادی نے اقلیتوں کو یقین دہانی کرائی تھی کہ آزادی کے بعد ان کے مذہبی عقائد اور ثقافت کا تحفظ کیا جائے گا۔ ممتاز اسکالر جی نورانی کے مطابق، قومی تحریک کے دوران کانگریس نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں مداخلت نہیں کرے گی۔ یہی وجہ ہے کہ پرسنل لا کے معاملے کو 1931ء میں کانگریس نے سپورٹ کیا تھا۔ آزادی کے بعد ہی یکساں سول کوڈ کی بحث شروع ہوئی تھی۔

آئین ساز اسمبلی میں بعض ارکان نے اس کے فوری نفاذ کا مطالبہ کیا، لیکن اس وقت عمومی رائے یہی تھی کہ اس متنازع مسئلے کو مستقبل کے لیے مؤخر کر دیا جائے، اور یوں اسے آئین کے رہنما اصولوں میں شامل کر دیا گیا۔ دائیں بازو کے رہنما یکساں سول کوڈ کی حمایت میں یہ دلیل دیتے ہیں کہ چونکہ یہ آئین کے رہنما اصولوں کا حصہ ہے، اس لیے اس کا نفاذ ضروری ہے۔ تاہم، وہ اس حقیقت کا ذکر کرنا گوارا نہیں کرتے کہ انہی رہنما اصولوں میں مزدوروں اور خواتین کے حقوق کے تحفظ پر بھی زور دیا گیا ہے۔ مزدوروں اور خواتین کے حقوق کے معاملے پر مکمل خاموشی اختیار کرتے ہوئے، بھگوا طاقتیں دانستہ طور پر صرف یکساں سول کوڈ پر زور دیتی ہیں۔ بھگوا تنظیمیں یہ بھی تسلیم نہیں کرتیں کہ رہنما اصولوں کے مقابلے میں بنیادی حقوق کا درجہ دستورِ ہند میں زیادہ اہم ہے۔ اقلیتوں کے مذہبی اور ثقافتی حقوق کو آئین بنیادی حقوق کا درجہ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور جمعیت علمائے ہند نے اس قانون کو آئین کے خلاف قرار دیا ہے اور عدالت میں اسے چیلنج کیا ہے۔

آج جنسی مساوات کے سب سے بڑے چیمپئن ہونے کا دعویٰ کرنے والی بھگوا تنظیم ہندو کوڈ بل کی سب سے بڑی مخالف رہی ہے۔ انہوں نے باباصاحب ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی پُرزور مخالفت کی اور انہیں ہندو سماج میں اصلاح کرنے سے روکا۔ آئین کے معمار، ڈاکٹر امبیڈکر ہندو کوڈ بل میں انقلابی اصلاحات لانا چاہتے تھے تا کہ ہندو خواتین کو بااختیار بنایا جا سکے، مگر اس وقت بھی دائیں بازو کی لابی نے ان کی زبردست مخالفت کی۔ اس وقت کے وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو نے بھی دائیں بازو کو خوش کرنے کے لیے جنسی مساوات کے اپنے ہی وعدوں سے پیچھے ہٹنے کا فیصلہ کیا۔ تب سے لے کر آج تک، ہندو توا تنظیموں کا رویہ ہندو سماج میں سماجی اصلاحات کے معاملے میں منفی رہا ہے۔ وہ نہیں چاہتیں کہ ہندو

خواتین کو مردوں کے برابر حقوق حاصل ہوں۔ عورتوں کی آزادی اور خود مختاری کو کنٹرول کر کے، ہندوتوا طاقتیں ذات پات کے نظام کو برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔ انہیں بخوبی معلوم ہے کہ جیسے ہی خواتین کو برابری ملے گی، ذات پات کی دیواریں کمزور ہونے لگیں گی۔

وقت گزرنے کے ساتھ بھگوا جماعت کا موقف بھی یکساں سول کوڈ پر بدلتا گیا، اور اس نے اسے جنسی مساوات سے جوڑ دیا، یہ وہی جماعت ہے جو کل تک ہندو کوڈ بل کی شدید مخالف تھی۔ ایک وقت تھا جب آر ایس ایس بھی یکساں سول کوڈ کے خلاف تھی۔ مثال کے طور پر، 1972ء میں آرگنائزر کو دیے گئے انٹرویو میں آر ایس ایس کے سربراہ ایم ایس گولوالکر نے یکساں سول کوڈ کی مخالفت کی تھی اور یکسانیت کے بجائے تکثیریت کی حمایت کی تھی۔ تاہم، 1980ء کی دہائی میں جب شاہ بانو کا مسئلہ منظر عام پر آیا تب بی جے پی نے یہ بات بخوبی سمجھ لی کہ مسلم خواتین کی مظلومیت کا مسئلہ اٹھا کر وہ اپنی اقلیت مخالف پالیسی کو مزید آگے بڑھا سکتی ہے۔ اسی تناظر میں، اس نے یکساں سول کوڈ کو اپنے انتخابی منشور کا حصہ بنایا اور سیکولر جماعتوں پر شدت پسند مسلم تنظیموں کے حامی ہونے اور مسلم خواتین کے حقوق کے مخالف ہونے کا پروپیگنڈہ شروع کیا۔

عدلیہ میں دستک

اس مشکل گھڑی میں مسلم تنظیموں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ یکساں سول کوڈ کے نفاذ کو جمعیت علمائے ہند نے نینی تال ہائی کورٹ میں ایک عرضی دائر کر کے چیلنج کیا ہے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے بھی اتراکھنڈ یونیفارم سول کوڈ کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا ہے۔ 21/فروری کو ایک پریس ریلیز جاری کرتے ہوئے بورڈ نے کہا کہ مذکورہ قانون نہ صرف شریعت کے خلاف ہے بلکہ یہ ملک کے آئین کی متعدد دفعات سے بھی متصادم ہے۔ جمعیت نے عدالت میں اتراکھنڈ میں یکساں سول کوڈ کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ آئین کے بنیادی حقوق کے خلاف ہے۔ 12/ فروری کو انقلاب میں شائع ایک خبر کے مطابق، جمعیت کے صدر ارشد مدنی نے کہا کہ وہ ایسے قانون کو نہیں مانیں گے، جو شریعت کے خلاف ہو۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یکساں سول کوڈ کا مسئلہ صرف مسلم پرسنل لا کا نہیں ہے، بلکہ ملک کے سیکولرازم کو بچانے کا بھی ہے۔ جہاں بھگوا تنظیموں کا دعویٰ ہے کہ یکساں سول کوڈ ملک کے قومی اتحاد کے لیے ضروری ہے، وہیں ارشد مدنی نے کہا کہ یہ ملک کی سالمیت کے لیے نقصان دہ ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ آئین کے آرٹیکلز 25، 26 اور 29 شہریوں کو مذہبی آزادی کی ضمانت دیتے ہیں۔ انہوں نے شریعت ایکٹ کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ یہ مسلم پرسنل لا کو تحفظ دیتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ جہاں موجودہ حکمران ملک میں تمام قوانین کو یکساں بنانے پر زور دے رہے ہیں، وہیں زمینی حقیقت یہ ہے کہ مختلف ریاستوں میں آئی پی سی اور سی آر پی سی سے متعلق قوانین بھی ایک جیسے نہیں ہیں۔ انہوں نے یہاں تک کہا کہ گائے کے ذبیحہ سے متعلق قوانین بھی ہر ریاست میں مختلف ہیں۔

لا کمیشن کی اہم رپورٹ

یکسانیت کے بجائے تنوع کی اہمیت پر اکیسویں لا کمیشن نے بھی اپنی رپورٹ میں زور دیا تھا، لیکن بی جے پی حکومت اسے مسلسل نظرانداز کر رہی ہے اور یکساں سول کوڈ کے نفاذ پر بضد ہے۔ لا کمیشن نے اگست 2018ء میں فیملی لا سے متعلق اپنی ایک اہم رپورٹ شائع کی تھی، جس میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ ملک میں یکساں سول کوڈ کو زبردستی نافذ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس رپورٹ میں مذہبی تنوع کی اہمیت پر زور دیا گیا اور تجویز دی گئی کہ خواتین کے خلاف غیر مساوی عائلی قوانین اور غیر منصفانہ اقتصادی نظام کے خاتمے کے لیے قانون سازی کی جانی چاہیے۔ مزید برآں، لا کمیشن نے واضح کیا کہ مسلمانوں میں کثرتِ ازدواج کے واقعات بہت کم ہیں، جبکہ غیر مسلم بعض اوقات اسلام قبول کر کے ایک سے زیادہ شادیاں کر رہے ہیں۔ کمیشن نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اسلام نے خواتین کو مالی حقوق دیے ہیں اور طلاق کے ذریعے ناکام شادیوں سے نجات حاصل کرنے کا راستہ فراہم کیا ہے۔

اس رپورٹ میں عیسائی عائلی قوانین میں بہتری کی سفارش کی گئی، جبکہ پارسی عائلی قوانین میں بھی تبدیلی کی تجویز دی گئی تاکہ کسی پارسی کے غیر پارسی سے شادی کرنے پر اسے کمیونٹی سے خارج نہ کیا جائے اور نہ ہی اس کی پارسی شناخت ختم ہو۔

مزید برآں، رپورٹ میں اس بات پر افسوس ظاہر کیا گیا کہ ہندو اپنے عائلی قوانین کے تحت ٹیکس میں رعایت حاصل کر لیتے ہیں، جبکہ عیسائیوں، مسلمانوں اور پارسیوں کو یہ سہولت میسر نہیں۔ رپورٹ میں ہندو کوڈ بل کی خامیوں اور اس میں اصلاحات کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا۔ اسپیشل میرج ایکٹ میں بھی اصلاحات کی سفارش کی گئی اور شادی سے قبل دی جانے والی ایک ماہ کی نوٹس کی شرط کو کم کرنے پر زور دیا گیا تاکہ بین المذاہب اور بین الذاتی شادیوں میں حائل رکاوٹیں ختم کی جا سکیں۔ کمیشن کی 182 صفحات پر مشتمل اس رپورٹ میں نکاح، طلاق، بچوں کی تحویل، سرپرستی، گود لینے، وراثت اور جائیداد کی تقسیم سے متعلق اصلاحات کا ذکر ہے۔ اس کا بنیادی مقصد صنفی امتیازات اور نابرابری کو ختم کرنا ہے۔ لا کمیشن کی رپورٹ کے مطابق، ہندو میرج ایکٹ 1955ء میں اگرچہ کچھ اصلاحات کی گئیں، مگر مزید بہتری کی ضرورت ہے۔ ہندو کوڈ بل کے نفاذ کے دوران شمالی ہندوستانی اعلیٰ ذات کی اخلاقیات کو پورے ہندو سماج

پر مسلط کر دیا گیا۔

رپورٹ نے اس پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ ابھی بھی ایسے شعبے موجود ہیں جہاں مردوں اور عورتوں کے درمیان عدم مساوات برقرار ہے، اور اگر ان رویوں کو آئین کے بنیادی حقوق کی روشنی میں پرکھا جائے، تو وہ قابل قبول نہیں ہوں گے۔ مثال کے طور پر، رپورٹ واضح طور پر کہتی ہے کہ بشریاتی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ہندو سماج میں اندرونی تضادات موجود ہیں، اور اگرچہ ان کے خلاف قوانین موجود ہیں، لیکن وہ مقامی سطح پر اب بھی رائج ہیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وسیع تر ہندو تشخص دوسرے اقلیتوں کو ان کے اپنے پرسنل لا بنانے کی اجازت نہیں دے رہا۔ مثال کے طور پر، سکھ برادری طویل عرصے سے یہ مطالبہ کر رہی ہے کہ انہیں آنند میرج ایکٹ 1909ء کے تحت اپنی شادیوں کو رجسٹر کرنے کی اجازت دی جائے، مگر انہیں ہندو کوڈ بل کے دائرے میں رکھا گیا ہے۔

جب خود لا کمیشن یکساں سول کوڈ کو غیر ضروری قرار دے چکا ہے اور عائلی قوانین کو وسیع تناظر میں دیکھ رہا ہے، تو پھر اسے ہندو بنام مسلمان کے مسئلے تک محدود کرنا نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ اب جب کہ یہ معاملہ عدالت تک پہنچ گیا ہے، تو کورٹ کا یہ فریضہ ہے کہ وہ پورے معاملے کو آئینی اقدار اور اس کی روح کو سامنے رکھ کر دیکھے۔ عدالت بخوبی جانتی ہے کہ ہندوستان اقلیتوں کو بنیادی حقوق کے تحت یہ ضمانت دیتا ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقائد پر عمل کرنے اور اپنی ثقافت کو محفوظ رکھنے میں مکمل طور پر آزاد ہیں۔

آئین سازوں کو خدشہ تھا کہ ریاست کہیں اقلیتوں کے مذہبی اور ثقافتی حقوق پر تجاوز نہ کرلے، اسی لیے انہیں آئینی تحفظ دیا گیا تاکہ مستقبل میں دائیں بازو کے حکمران اپنی طاقت کا غلط استعمال نہ کرسکیں۔ اس کے علاوہ، عدالت کو فیصلہ دیتے وقت ملک کی تحریکِ آزادی اور بھارت کے کثیر المذاہب معاشرے کو بھی دھیان میں رکھنا چاہیے۔ اسے اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ کیا جمہوریت اقلیتوں کے سماجی، اقتصادی اور ثقافتی حقوق کی ضمانت دیے بغیر کامیاب ہوسکتی ہے؟

بابا صاحب امبیڈکر، جنہوں نے بھارت کے آئین کو تیار کرنے میں بڑی محنت کی، ان کی بھی یہ رائے تھی کہ جمہوریت کا مطلب موبو کریسی (ہجوم کی حکمرانی) نہیں ہے۔ انہوں نے صاف طور پر کہا تھا کہ اقلیتوں کے حقوق کے بغیر جمہوریت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ملک کے محکوم طبقات عدالت سے انصاف کی امید لگائے بیٹھے ہیں۔

بقیہ: "ہندوستان میں مسلمانوں کی سماجی و معاشی پسماندگی۔۔۔"

پسماندگی اور نظرانداز کیے جانے میں حکومتی پالیسیوں کا کردار

سچر کمیٹی اور رنگناتھ مشرا جیسی کمیٹیوں نے فوری مداخلت کی ضرورت کو تو اجاگر کیا ہے مگر پھر بھی یا تو ان کی سفارشات کو نظرانداز کیا جاتا رہا ہے یا ان کو بے وزن کر دیا گیا ہے۔ کتنی ہی حکومتیں آئیں مگر ان تمام نے مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کے سلسلے میں سرد مہری دکھائی۔ اور اگر کچھ پالیسیاں نافذ بھی ہوئی ہیں تو یا تو وہ محض علامتی طور پر ہیں یا انہیں ناقص طریقے سے نافذ کیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر کہنے کے لیے اگرچہ کچھ اسکیمیں اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے بنائی تو گئی ہیں مگر اکثر لوگ ان اسکیموں کا فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ فنڈ کی تقسیم میں شفافیت، ذمہ داری کی کمی اور کمیونٹی کی ناقص شمولیت کی وجہ سے بہت سے اقدامات غیر موثر ثابت ہوئے ہیں۔

ہر طرح کے نظریات کی حامل سیاسی پارٹیوں نے مسلمانوں کو کچھ ٹھوس فوائد پہنچانے کے بجائے محض ووٹ بینک کے طور پر ان کا استحصال ہی کیا ہے۔ پالیسیوں پر مستقل توجہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ بہت ضروری ہوگیا ہے کہ اب مسلم مسائل کو حل کرنے کے طریقوں میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔

ماحصل

مسلمانوں کی سیاسی و معاشی پسماندگی ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے جس کی جڑیں تاریخی ناانصافیوں اور موجودہ دور کی نظامی ناکامیوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اگرچہ کچھ مواقع پر حالات میں سدھار آیا ہے مگر ابھی بھی ایک عادلانہ سماج کی تشکیل کے لیے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ مسلم کمیونٹی کو مضبوط بنانے کا مسئلہ محض سماجی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ ہندوستان کے بحیثیت متحد جمہوری ملک ترقی کرنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ تعلیم، ملازمتوں اور نمائندگی کے سلسلے میں ہو رہی ناانصافیوں کو ختم کر کے ہندوستان اپنی سب سے بڑی اقلیت کی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتا ہے۔ اس کے لیے حکومتی پالیسیوں، کمیونٹی کے اقدامات اور معاشرتی تبدیلی پر مبنی مشترکہ کوششوں کی ضرورت ہے۔ ایک ایسا ہندوستان جو تمام طبقات کو ساتھ لے کر چلے وہی ہندوستان مضبوط ہوسکتا ہے۔ پسماندہ طبقات کی ترقی کے لیے اپنے سرمایہ کو لگا کر یہ ملک معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ سماجی ہم آہنگی اور عدل و انصاف قائم کرسکتا ہے۔

آئندہ راہیں یقیناً بہت ناہموار ہیں مگر عزم مصمم اور باہمی تعامل کے ساتھ ہم عدل و انصاف پر مبنی مستقبل کو یقینی بنا سکتے ہیں۔